R. No. 2186/57 | Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

ٹیلی فون — ۲۹
قیمت فی پرچہ ۱۰
...

جلد ۲۵ ۔ شمارہ ۶ | ایڈیٹر: آلِ احمد سرور | ۸ر فروری ۱۹۶۶ء

اداریہ

ساہتیہ اکیڈمی کا انعام

ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۶۵ء کا اردو کا انعام راجندر سنگھ بیدی کو ان کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' پر دیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ جب ان کا پہلا مجموعہ 'دانہ و دام' نکلا تو اس وقت ارباب نظر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ایک منفرد کارنامہ اور اردو ادب کے افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کے بعد 'گرہن' نے اس رائے کو اور پختہ کر دیا۔ گرہن کے بعد راجندر سنگھ بیدی کے ڈراموں کا ایک مجموعہ 'سات کھیل' کے نام سے سامنے آیا۔ تقسیم کی وجہ سے جو غارت گری ہوئی اس نے بیدی سے 'لاجونتی' جیسا افسانہ لکھوایا جس میں فن اپنی معراج پر نظر آتا ہے۔ بیدی کا ایک اور طویل افسانہ 'اپنے دُکھ مجھے دے دو' خاصے کی چیز ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی مبارکباد کے قابل ہے کہ اردو کے اس مایۂ ناز افسانہ نگار کے ادبی مرتبے کا اس نے اس طرح اعتراف کیا۔ ہم بیدی صاحب کو بھی اس اعزاز پر مبارکباد دیتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ فخر ہے کہ اب تک ساہتیہ اکیڈمی کے انعام زیادہ تر شاعری پر یا نثر پر صرف اقبال علی عرشی اور خواجہ غلام السیدین کو انعام ملا تھا لیکن افسانے پر یہ پہلا انعام ہے۔ اردو افسانے نے جو ترقی کی ہے اس کا یہ اعتراف ہر طرح مسرت کا باعث ہے۔

دہلی میں انجمن کے دفتر کی عمارت

ہم یہ اطلاع پہلے دے چکے ہیں کہ انجمن کو راؤس ایونیو نئی دہلی میں چوتھائی ایکڑ زمین مل گئی ہے۔ مجلس عام نے اپنے ۵ دسمبر کے جلسے میں دفتر کی عمارت بنوانے کے لیے اور اس کے لیے مناسب سرمائے کا انتظام کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ ۱۶ جنوری کو اس کمیٹی کا جلسہ ہوا اور اس جلسے میں صدر انجمن کرنل بشیر حسین زیدی اور جنرل سکریٹری پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی نقشہ بنوانے اور تعمیر کے کام کی نگرانی کرنے کے لیے بنائی گئی۔ اخراجات کا اندازہ چار اور پانچ لاکھ کے درمیان ہے۔ ذیلی کمیٹی نقشہ بنوا کر مجلس عام کی کمیٹی کے سامنے پیش کرے گی۔ عمارت کے نام کا فیصلہ مجلس عام کرے گی۔ توقع یہ ہے کہ تین چار ماہ کے اندر نقشہ تیار ہو جائے گا اور پھر تعمیر کا کام شروع ہو سکے گا۔ دفتر کی تعمیر کے سلسلے میں حکومت سے معقول امداد کی توقع ہے۔ انجمن کے پاس بھی ایک لاکھ سے اوپر روپیہ اس کام کے لیے موجود ہے لیکن اس کے علاوہ ہمیں اردو دوستوں سے بھی یہ امید ہے کہ وہ انجمن کے دفتر کو اردو دوستوں کے شایانِ شان بنانے کے لیے مناسب مالی امداد سے دریغ نہ کریں گے۔ زمین جن شرطوں پر دی گئی ہے ان میں ایک خاص شرط یہ ہے کہ دو سال کے اندر عمارت تیار ہو جائے۔ یقین ہے کہ ہنگامی حالات اور مالی دشواریوں کے باوجود ہم اس مدت کے اندر ہی دفتر کی عمارت تیار کر لیں گے۔ اردو دوستوں سے چندے کے لیے علیحدہ اپیل شائع کی جائے گی۔

غالب کی صد سالہ برسی

غالب کی صد سالہ برسی کو اب صرف تین سال باقی رہ گئے ہیں۔

اس شمارے میں

ساہتیہ اکیڈمی کا انعام — ۱
دہلی میں انجمن کے دفتر کی عمارت — ۱
غالب کی صد سالہ برسی — ۲
۱۹۶۵ء کے ساہتیہ اکاڈمی انعامات کا اعلان — ۲
خلیل الرحمٰن اعظمی کا دوسرا مجموعۂ کلام شائع ہو گیا — ۲
عمیق حنفی کی طویل نظم کتابی صورت میں شائع ہو گئی — ۲
کمار پاشی کا پہلا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آ گیا — ۲
مسعود احمد غالب اکیڈمی کے دفتر میں — ۲
ہریانی زبان کا پہلا ناول — ۲
عشق نامہ — ۳، ۴
غزلیں — ۵
آزاد مرحوم — ۵
ٹھاکر چند مرحوم کے انتقال پر — ۵
آزاد مرحوم — ۵
سفر نامے آ گئے — ۶، ۷
اردو رسم خط میں اصلاحات — ۸
جامع اللغات — ۸
لال بہادر شاستری جی کے انتقال پر تعزیتی جلسہ حیدرآباد، راجستھان اور انجمن دہلی پٹیالہ — ۹
شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تقریر — ۱۰
حبیب الرحمٰن کے مجموعۂ کلام کی رسم اجرا — ۱۰
انجمن ترقی اردو ہند کے وفد کی وزیر اعظم اور وزیر قانون سے ملاقات — ۱۲
اردو سے متعلق تجاویز ... کو سرکاری زبان میں شامل کیا جائے — ۱۲

ہم نے اس سے پہلے بھی اردو کے تمام اداروں کو توجہ دلائی تھی کہ وہ اس موقع کے لیے اپنی بساط کے مطابق جلسے جلوس پروگرام بنائیں انجمن ترقی اردو ہند نے اپنا پروگرام تیار کر لیا ہے۔ صد سالہ برسی کی مرکزی کمیٹی جو دہلی میں قائم ہوئی ہے اور جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند ہیں، سب پروگراموں کو مربوط کرے گی اور کل ہند پیمانے پر تقریبات کا انتظام کرے گی۔ لیکن اردو کے اداروں اور یونی ورسٹیوں کے اردو کے شعبوں کو اپنے وسایل کے مطابق اپنا اشاعتی پروگرام خود بنانا ہے۔ یہ پروگرام اگر وہ "ہماری زبان" میں اشاعت کے لیے دے دیں تو سب کو اطلاع ہو جائے گی اور پھر کام کی تکرار نہ ہوگی۔ اشاعتی پروگرام ادبی اہمیت کے علاوہ موجودہ دور کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر بنانا چاہیے اور اس میں دوسری زبانوں میں غالب کے کلام کو مقبول کرنے پر خاص زور دینا چاہیے۔

۱۹۶۵ء کے ساہتیہ اکاڈمی انعامات کا اعلان

اردو کا انعام راجندر سنگھ بیدی کو دیا گیا

نئی دہلی۔ ۲۰ فروری۔ ساہتیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۵ء کے انعامات کا اعلان آج نئی دہلی میں کر دیا۔ امسال بارہ کتابوں کو انعامات کے لیے منتخب کیا گیا۔ ہر مصنف کو ایک تحفے کے ساتھ پانچ ہزار روپے کا چیک ۲۰ فروری ۶۶ء کو ایک خاص تقریب میں راشٹرپتی دیں گے۔

اردو کا انعام چوٹی کے افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کو ان کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" پر دیا گیا۔ انعامات کی تفصیل درج ذیل ہے:

زبان	نام مصنف	نام کتاب	صنف
بنگالی	بشنو ڈے	"سمرتی ستا بھابیشت"	شاعری
انگریزی	آنجہانی ویریا ایلون	"دی ٹرائبل ورلڈ آف ویریا ایلون"	سوانح عمری
گجراتی	کاکا (دی بی) کالیلکر	"جیون ویوستھا"	انشائیے
ہندی	ڈاکٹر نگیندر	"رس سدھانت"	تنقید
کنڑ	ایس وی رنگناں	"رنگا بنٹ پا"	فلسفیانہ تاثرات
ملیالم	شریمتی وی بالامنی اما	"منتھاسی"	شاعری
مراٹھی	پی۔ ایل۔ دیش پانڈے	"وکیتی انی والی"	خاکہ نگاری
اڑیا	بیکنٹھ ناتھ پٹنائک	"اترائن"	شاعری
پنجابی	کرتار سنگھ دگل	"اک چھٹ"	افسانے
تامل	پی۔ سری آچاریہ	"سری رامانوجار"	سوانح
تلگو	دا پا پد لوسبا راؤ	"مصرا منجری"	شاعری
اردو	راجندر سنگھ بیدی	"ایک چادر میلی سی"	ناولٹ

خلیل الرحمٰن اعظمی کا دوسرا مجموعۂ کلام شایع ہو گیا

علی گڑھ ۱۲ فروری۔ اردو کے مشہور شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی کا دوسرا مجموعہ کلام "نیا عہد نامہ" شایع ہو گیا ہے۔ اس مجموعے میں پہلے مجموعہ کلام "کاغذی پیرہن" کے بعد کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ۱۵۲ صفحات کے اس مجموعے کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے اور انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ اور انڈین بک ہاؤس محمد علی روڈ علی گڑھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

عمیق حنفی کی طویل نظم کتابی صورت میں شایع ہو گئی

اندور ۱۲ فروری۔ عمیق حنفی کی معرکۃ الآرا طویل نظم "سند باد" کتابی صورت میں شایع ہو گئی ہے۔ اس طویل نظم کو معتدد ادیبوں اور شاعروں نے سراہا ہے۔ یہ ڈیڑھ روپے میں ۸۱۸ راجہ کی مہو (کینٹ) ایم۔ پی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

کمار پاشی کا پہلا مجموعۂ کلام منظر عام پر آ گیا

دہلی ۳۰ فروری۔ نئی نسل کے نمائندہ شاعر کمار پاشی کی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ کلام "پرانے موسموں کی آواز" شایع ہو گیا ہے۔ یہ دو روپے پچاس نئے پیسے میں مکتبۂ تحریک انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سمپورنانند غالب اکیڈمی کے دفتر میں

وارانسی، ۲ فروری۔ آج غالب اکیڈمی کے دفتر میں راجستھان کے گورنر سمپورنانند کا خیر مقدم کیا گیا اکیڈمی کے صدر مولانا خیر بہوروی نے ممبروں کو گورنر سے متعارف کرایا اور بتایا کہ اکیڈمی نے بنارس کے راجہ جیت سنگھ کے فرزند راجہ بلوان سنگھ کا غیر مطبوعہ کلام حاصل کر لیا ہے راجہ بلوان سنگھ اپنے زمانے کے اچھے اردو شاعر تھے۔

سکریٹری نے اکیڈمی کی تازہ ترین تصنیف "میں اور تو" گورنر کو پیش کی۔ گورنر نے اکیڈمی کے کام کی تعریف کی۔ (سیاست جدید)

ہریانی زبان کا پہلا ناول

نئی دہلی۔ ۲۷ جنوری۔ ہریانہ لوک منچ کی طرف سے ہریانی میں پہلا ناول چھاپا جا رہا ہے۔ یہ جماعت پنجاب اور دہلی میں ہریانوی ادب کی نشر و اشاعت کا کام کرتی ہے۔ یہ ایک طربیہ ہے اس کے مصنف راجہ رام شاستری ہیں۔ یہ ناول یہ ثابت کرنے کے لیے چھاپا جا رہا ہے کہ پنجابی اور ہریانوی پنجاب کی دو زبانیں ہیں۔ ہریانوی پنجابی اور ہندی سے بالکل مختلف ہے۔

راجہ رام شاستری کا کہنا ہے کہ "ہندی کو پنجاب کی زبان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر شاستری کے اس ناول کا نام "پیا پا دیسیہ" ہے یہ ناول "ماں بیٹا" کے نائیٹل کے ساتھ فلمایا جا چکا ہے۔

(قومی آواز)

کوکب قدر سجاد علی مرزا

عشق نامہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

بیان قلق کا ہے اور اس کی وضاحت بھی قلق ہی پر فرض ہے کہ جہاں عشق نامہ کی تصنیف کے بارے میں اتنا سجا ہوا بیان دیا ہے، عشق نامہ کے موضوع کے بارے میں بھی کچھ بتائیں کہ اس میں ہے کیا! لیکن قلق بے چارے مجبور اور ہم جواب کے لیے مضطرب۔ ممکن ہے انھوں نے فاضل صاحب کو کچھ بتایا ہو لیکن اگر اس میں سوانح عمری کا ذکر ہوتا تو فاضل صاحب وہ غلطی ہی کیوں کرتے جو انھوں نے کی۔ بالفرض زیب داستان کے لیے اگر ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ عشق نامہ سے مراد وہی مثنوی ہے جسے پہلے شیخ تصدق حسین اور چند سال بعد سید سلیمان حسین نے اسیر کی تصنیف بتایا جب بھی یہ پہلو تشنۂ تحقیق رہا جاتا ہے کہ کیا سبب تھا کہ ایک ایسی کتاب کے بارے میں جو اس اہتمام سے بھرے دربار میں پیش کی گئی اور جس میں ترمیم اور اضافہ بھی مخصوص بابولی اور خوش نویسوں کے علم میں روبرو اسیر نے کیا۔ اس کا ذکر نہ اسیر کریں اور نہ کوئی اور شخص کرے اور واجد علی شاہ جو خود برا بھلا کہنے پر قادر تھے اور اصلاح کے ضمن میں یہ بھی منظور نہ تھا کہ آتش یا برق یا اسیر ان کے کلام میں اپنے الفاظ داخل کریں کئی ہزار شعر کی پوری مثنوی برضا و رغبت قبول کر لیں؟ شرر اور شرر کے علاوہ مختلف با خبر حضرات کا بیان کہ واجد علی شاہ کا کلام خود انھیں کا ہے۔ اس الزام کو قبول کر لینے کے بعد کھوکھلا او بے حقیقت نظر آتا ہے۔

مذکورۂ بالا بیانات سے قطع نظر جو سب کے سب اپنی صحت کے ہیں اور ابہام اور نفس واقعہ سے دوری کے سبب ناقابل التفات ہیں ہمیں ایک ہمعصر تذکرہ نگار کا بیان بھی ملتا ہے جس پر صاحبانِ تحقیق نے کوئی رائے زنی نہیں کی ہے۔ سید محسن علی محسن نے اپنے تذکرہ سراپا سخن میں پانچ جگہ اسیر کا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ "صاحب خاص سلطان عالم مع خطابات لکھا ہے۔ لیکن تصنیفات کا ذکر یہاں نہیں ہے:۔

- "صاحب دیوان فارسی و ریختہ اور عشق نامہ" ص۱۲۵
- "ایک دیوان فارسی دو دیوان ہندی ان سے یادگار ہیں" ص۲۱۲ حاشیہ
- "صاحب دیوان، شاگرد رشید میاں مصحفی" ص۲۳۲
- "صاحب دیوان شاگرد مصحفی" ص۲۵۸
- "صاحب دیوان ہندی و فارسی" ص۲۶۳[1]

مندرجہ بالا بیانات میں صاحب تذکرہ نے صرف ایک جگہ عشق نامہ کو اسیر کی تصنیف بتایا ہے اور بیانات میں اختلاف اس امر کی کافی شہادت ہے کہ جو کچھ لکھا گیا برسبیل تذکرہ نہ کہ برائے صحتِ بیان، مؤلف نے شاید اس تمام ذخیرہ کو دیکھا بھی نہیں، پھر کس امید پر ہم توقع کریں کہ عشق نامہ سے مراد وہی مثنوی ہے جو زیر بحث ہے۔ قلق کی طرح انھوں نے بھی صرف نام لیا ہے اور صرف نام فیصلہ کن شہادت نہیں[1]۔ ہماری زبان کے ۲۲ نومبر ۱۹۶۵ء کے شمارے میں ابو محمد سحر صاحب نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، لیکن ان کا استدلال مثنوی درۃ التاج کی حد تک پہنچ کر رک گیا۔ کیونکہ انھیں مثنوی درۃ التاج دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ درۃ التاج عشقیہ مثنوی ہے اور اس کا معروف نام "عشق نامہ" ہی ہے جو سراپا سخن اور قلق کی روایت میں ملتا ہے اور جسے صحت کے ساتھ اسیر کے شاگرد امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں درج کیا۔ لیکن ناموں کی بھول بھلیاں ہیں اس مقام سے دور راہیں پھوٹتی ہیں۔ ایک "عشق نامہ" نامی جس پر سید سلیمان حسین صاحب گامزن ہیں۔ اور دوسری گمنام جس پر شیخ تصدق حسین صاحب بھٹکتے ہوئے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پیشتر ضروری ہے کہ اس نایاب مثنوی سے وہ اقتباسات پیش کر دیے جائیں۔ جن سے اس کا عشقیہ اور "عشق نامہ" شہرت پانا تعلق رکھتا ہے۔

مثنوی درۃ التاج میں "دربیان سبب تالیف کتاب گوید" کے تحت چھ صفحوں میں اسیر نے اپنی عاشق مزاجی اور وارفتگی کو بیان کیا ہے:۔

شہرہ ہے وحشتِ جوانی — آفت ہے طبیعتِ جوانی
درپیش تھیا مشیں بلائیں — انداز نئے نئی ادائیں
بھایا جو کسی کا مسکرانا — جی ہو گیا جسم سے روانا
ترچھی نظروں نے مار ڈالا — نازک کمروں نے مار ڈالا
کھایا جو کسی کمر نے لچکا — پہنچا سر دست دل کو جھٹکا
دیکھا کسی آنکھ میں جو کاجل — دل ہو گیا سوز غم سے مشتعل
کیفیت نشۂ جوانی — انداز خمار سرگرانی
وہ آتش عشق سینہ میں تیز — جس سے کہ زبان شعلہ انگیز
ہر عضو سے داغ عشق پیدا — رنگ گل باغ عشق پیدا
دل کہنے لگا کہ ہاں بجا ہے — یہ بات نہیں کوئی بلا ہے
کہیے تو کہوں کوئی کہانی — جی بہلے ہجر کر غم نہانی
کیوں غیر کا دل پہ داغ سہیے — گزری ہوئی اپنی کیوں نہ کہیے
اپنا بھی تو عشق میں ہے حصہ — پُر درد ہے سب سے اپنا قصہ

---

[1] جس طرح ایک کتاب کے دو نام ہو سکتے ہیں (ہماری زبان ۸ دسمبر ۱۹۶۵ء۔ سحر صاحب کا مراسلہ) اسی طرح دو کتابیں بھی ایک نام کی ہو سکتی ہیں اور ناموں کا یہی معروف و مجہول ہونا غلط فہمیوں کا سبب بن جاتا ہے۔

[1] مطبوعہ منشی نولکشور ۱۲۷۷ھ

القصہ کیا یہ عہد و اثق منظوم ہو داستان صادق
مطبوع جہاں جو داستاں ہو خلوت میں انہیں عاشقاں ہو
جو اس کو سنے وہ دنگ ہو جائے گلزار جہاں میں رنگ رہ جائے

اور اس عنوان کے بعد اسی سے ہیں "در بیان عشق گوید ص۲۳" "در بیان معشوق گوید ص۲۴" آگے بڑھتے گئے ہیں اور جگہ جگہ عشق عاشقاں، عاشق، معشوق کی گردان ہے۔ مثنوی میں مختلف مقام ایسے ہیں جن کی تصویر کشی ممکن ہے۔ اور ایک مسلسل مربوط قصہ نہیں ہے بلکہ مختلف واقعات ہیں جن کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔ ختم کے قریب واضح الفاظ میں لکھتے ہیں ؎

لکھتا ہوں یہاں سے عشق نامہ پھرتی ہے عنان اسپ خامہ
ص۱۹۱

مثنوی کا نام درۃ التاج ہے ؎

یہ وصف جو ہے سخن کو معراج زیبندہ ہے نام درۃ التاج
ص۲۴۰

لیکن قطعات تاریخ لکھنے والوں نے اس نام کی پرواہ نہیں کی ہے۔ عشق نامہ کی رعایت سے قطعے کہے ہیں۔ صرف دو ہی تو قطعے ہیں۔ مقبول الدولہ بہادر قبول اپنے قطعے میں لکھتے ہیں ؎

(انتخاب)....

عشق خود نظم کرد از سلطان آنکہ در اصل ہست جان جہان
سیر ایں مثنوی چو حاصل شد مدح کردند نکتہ دان جہان
سال طبعش شنو ز طبع قبول زیب و سرتاج عاشقان جہان
۱۲۷۰ھ

دوسرا قطعہ امیر علی خاں ہلالؔ کا ہے ؎

(انتخاب)....

بہر تاریخش چو در بحر تفکر غوطہ زد این ہلالؔ خانہ زاد خسرو گیتی ستان
از تہ دل شد گوہر مصرعی آمد بلب قصۂ عشق از اسیر زلف سلطان جہان
۱۲۷۰ھ

تلقؔ اور محسنؔ کے بیانات کی تاویل اس مثنوی اور ان کے قطعات تاریخ سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ تلقؔ نے "عشق نامہ" نامی ایک مثنوی اسیرؔ کی تصنیف بتائی ہے۔ اپنے بیان میں یہ اشارہ بھی کہیں نہیں کیا ہے کہ وہ مثنوی واجد علی شاہ نے خود اپنائی۔ تلقؔ کے کہنے یا افضل صاحب کے سمجھنے میں کچھ سہو ہو تو تعجب نہیں، جو مفہوم اس عبارت سے نہیں نکلتے ان پر اصرار کرنے سے حاصل؟ فاضل کے بیان میں تضاد ہمیں اس لیے دکھائی دے رہا ہے کہ ہم اپنے طبعزاد خیال کی اس میں سند تلاش کرنا چاہتے ہیں، اس کا امکان زیادہ ہے کہ ان کے دونوں بیان اپنی اپنی جگہ درست ہوں اور بات کہنے اور بخوبی نہ کہنے کے سبب یہ نقص واقع ہوا ہو۔ محسنؔ کا بیان جو اسی مثنوی کے زمانے کا ہے غالباً شنیدہ پر مبنی ہے۔ مثنوی کی انھوں نے شاید شہرت ہی سنی خود نہیں دیکھی اس لیے جو سنا اسے بھی ایک

۱؎ درۃ التاج مطبوعہ مطبع سلطانی ص۲۴۰-۲۴۳ کا انتخاب

جگہ لکھ دیا۔ بات کچھ اور ہو اور شہرت کچھ اور پا جائے ایسا صرف عشق نامہ ہی کے معاملے میں نہیں ہوا۔ سرود سلطانی نامی ایک کتاب واجد علی شاہ نے مرزا رجب علی بیگ سرورؔ سے ۱۲۹۶ھ میں لکھوائی۔ یہ فردوسی کی نظم شمشیر خانی کا نقشی اردو ترجمہ ہے۲؎۔ مثنوی حزن اختر کی ناشرہ محبوب علی صاحب نے اسے واجد علی شاہ کی تصنیف شمار کیا ہے۳؎۔ کتاب اگر ناپید ہو اور غیر معمولی شہرت حاصل کر لے تو خیال آتا ہے کہ کبھی کوئی اسے واجد علی شاہ کی تصنیف کہے گا اور کوئی سرورؔ کی۔ سرود سلطانی کے قضیہ میں کتاب کے نام نے دھوکا دیا۔ تذکرۂ اختر کے معاملے میں تخلص اختر نے دھوکا دیا۔ ابتدا میں گارساں دتاسی اور دتاسی کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبد اللہ مرحوم نے اسے واجد علی شاہ اختر کی تالیف بتایا ہے۴؎۔ یہ تذکرہ قاضی محمد صادق خاں اختر کی تالیف ہے۵؎ اور غالباً ناپید ہے۔ اسیرؔ کی کتاب جس کا ذکر معارج الفضائل، درۃ التاج اور تذکرۂ آب بقا میں ملتا ہے چونکہ ناپید ہے اس لیے آسانی یا زبردستی اسے تلاش کرنے بیٹھتے ہوئے ہیں اس لیے جہاں ذرا سی جھلک نظر آ جاتی ہے فوراً کہہ اٹھتے ہیں "وہ ہے! وہ ہے!" ایک ایسی جھلک مجھے بھی دکھائی دی ہے لیکن از قسم دلیل اور سند میرے پاس کچھ نہیں۔ مثنوی درۃ التاج میں حکایات وغیرہ پر مشتمل آخری حصہ ضرورت سے زیادہ طویل اور بے جوڑ ہے۔ ابتدا میں اپنے جاہ و حشم کی تعریف میں واجد علی شاہ نے جو بیان نظم کروایا ہے اسیرؔ نے اس کی وضاحت مثنوی ہی میں کر دی ہے۶؎ لیکن اس آخری حصہ میں اور انصاف سے متعلق منظوم حکایتوں کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ مثنوی کے ابتدائی حصہ کے بارے میں خود اسیرؔ کا بیان ہے کہ اول زمانۂ مصاحبت میں کچھ فرمائش اور کچھ خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بطور خود کہا۔ اس کے بعد واجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے ابتدائی دور حکومت میں نہ صرف معتوب بارگاہ رہے بلکہ اسیری میں بھی کچھ عرصہ بسر کیا۔ اسی تنگدستی اور پریشان حالی کے زمانے میں بادشاہ کی نظر عنایت پھر مبذول ہوئی اور پھر کچھ کہلوایا گیا۔ اگر یہ فرمایشی شاعری ابتدا کے کلام کو مکمل کروانے کے لیے ہو تو عین حسب حال ہے کیونکہ مثنوی کا یہی حصہ مبہم اور غیر مربوط ہے۔ اور مثنوی کے اس حصہ کا ختم دعا گو کرتے ہوئے ہیں خود اسیرؔ

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

۱؎ سرود سلطانی، مطبوعہ مطبع سبحانی، ۱۲۹۸ھ ص۲-۵

۲؎ حزن اختر، مطبوعہ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ ص۱۳۳

۳؎ ہماری زبان کے مباحثے میں یہ نام بھی زیر بحث آیا ہے غالباً۔

۴؎ شعرائے اردو کے تذکرے، لاہور، ستمبر ۱۹۵۲ء

۵؎ سخن شعرا، عبد الغفور نساخ، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ص۱۰۔ تذکرے کا صحیح نام تذکرہ "آفتاب عالم تاب" لکھا ہے۔

۶؎ شاہ کو کہاں زباں سے لیکن۔ بن آئے سے ہی کہے شعر سخن ✦ کچھ وصف جاہ و وصف حسن رخ ✦ کچھ چاہیئے مدح جاہ و حشمت ✦ کی عرض یہ میں نے اکی یاوری سلائے گی یہ مجھ کو بیزاری ✦ کچھ شعر تیرے سنا دوں گا میں۔ تحفہ کوئی اس لاؤں گا میں ✦ (درۃ التاج ص۹-۱۰)

غزلیں

محمد علی الہاشمی

سکونِ دل کو مرے کچھ ہوا ہوا بھی نہیں
نظر نظر میں کچھ ایسا کہا کہا بھی نہیں

لبوں میں کچھ ہوئی جنبش نظر ہوئی نیچی
کچھ ایسا وعدۂ فردا ہوا ہوا بھی نہیں

چھپا رہا دلِ مضطر میں ایک کانٹا سا
کہ ایک بات کا شکوہ رہا رہا بھی نہیں

زباں پہ آئی وہی بات دل میں جو کچھ تھی
کہا کسی نے جو ہم کو برا برا بھی نہیں

وفا کی خو نہیں ان کو جفا ہی کچھ ہوتی
مگر جو ہوتی ہے ان کی جفا جفا بھی نہیں

کرم ہوا بھی جو ان کا تو کچھ تامل سے
خلوص ایسے کرم میں ذرا ذرا بھی نہیں

ابھی سے نظمِ جہاں میں ہے ایک ہلچل سی
اشارۂ خمِ ابرو کھلا کھلا بھی نہیں

خیالِ یار نے بخشی ہے ایک یکسوئی
کہ اب مسرت و غم کا مزا مزا بھی نہیں

غمِ فراق سے حاصل ہوا غمِ عالم
کہیں ہزار اسے سب برا برا بھی نہیں

حدِ حیات ہے معلوم ہاشمی لیکن
کہیں کہ اس سے اگر دل لگا لگا بھی نہیں

ابو محمد سحر

خوشی کی چھاؤں ہے دل پر نہ غم کے سائے ہیں
دیارِ عشق میں موسم عجیب آئے ہیں

رہے جو یاد تجھے بھی تو کام کے ہیں بہت
وہ دن کہ ہم نے ترے پیار میں گنوائے ہیں

انھیں بھی آج سراپا الم بنا ڈالا
برا ہو دل کا بڑے حوصلے بڑھائے ہیں

کہاں یہ ہوش کہ کچھ اہتمام ہم کرتے
یہ بام و در ترے آنے سے جگمگائے ہیں

جگہ ملی نہ کہیں جن کو اشک باری کی
تمھاری بزم میں آئے تو مسکرائے ہیں

کھلا نہ غنچۂ دل ہی تو پھر کہاں کی بہار
ہلا کے بادِ صبا نے چمن کھلائے ہیں

جہاں سے اٹھیں جفاؤں کی آندھیاں اکثر
چراغ اہلِ وفا نے وہیں جلائے ہیں

غمِ حبیب نہیں کچھ غمِ جہاں سے الگ
یہ اہلِ درد نے کیا مسئلے اٹھائے ہیں

نہ ان سے کوئی شکایت سحر نہ وجہِ ملال
یہ بات کیا ہے کہ آنسو پلک تک آئے ہیں

دلیپ بادل

آہ! محروم

یہ کون آج بزمِ سخن سے چلا گیا
کیوں ہو گئی ہے محفلِ شعر و سخن اداس

بادلؔ یہ مرگِ حضرتِ محروم تو نہیں
جس سے تمام دشت ہیں غمگیں، چمن اداس

پروانے کیوں یہ سوختہ جانی سے ہیں نڈھال
کیوں ہو گئی ہے شمعِ سرِ انجمن اداس

حُبِّ وطن کا قافلہ سالار کون تھا
دیکھو ہیں کس کی موت سے اہلِ وطن اداس

گریاں تمام ہند ہے پنجاب ہی نہیں
ہے کس کے ارتحال سے ہر مرد و زن اداس

فرحت کیفی

تلوک چند محروم کے انتقال پر

اے کہ تو میرِ کاروانِ ادب   اے کہ تو فکرِ عصرِ نو کا نقیب
اے کہ تجھ سے تھی آبروئے حیات   کس قدر زندگی تھی تجھ سے قریب

موت چپ چاپ کام کرتی ہے   بے خبر، بے زبان ہے ظالم
کتنی صدیاں گزر گئیں لیکن   پھر بھی کتنی جوان ہے ظالم

کیا کہوں آج موت کا سایہ   کس طرح زندگی کو ڈھا سا گیا
دیکھتے دیکھتے چراغِ ادب   زد میں طوفاں کی جھلملا سا گیا

مرنے والوں نے ویسے مر کر بھی   موت کا راز کر لیا معلوم
یہ تاسف ستائے گا برسوں   آدمی آدمی سے ہے محروم

خوشتر مکرانوی

آہ! محروم

علم و ادب کا آفتاب
گیت و سرود کی شراب
دنیائے امن کے شباب
تو کیوں خموش ہو گیا
کیسے جہاں میں کھو گیا
اہلِ ادب کو چھوڑ کر

صفحہ ۴ سے آگے

کا یہ معنی خیز انکسار فراموش نہ کرنا چاہیے :

"میں نے حسب الحکم اسے نظم کیا جس سے بہت خوش ہوئے
مجھے بھی ان کی خوشی سے کام تھا"[1]

ناموں کی ظاہری مشابہت کیسے سنگین نتائج پیدا کرنے کا موجب ہو سکتی ہے اور کیسے کیسے صاحب نظر حضرات اس سہو کا شکار ہو سکتے ہیں اس کے لیے سو برس پہلے کے دفتر الٹنے کی ضرورت نہیں۔ پچھلے ہفتہ کا ہماری زبان دیکھ لینا کافی ہے۔ وہاں آسی نے تخلص اور محسن نے کتاب کے نام سے دھوکا کھایا تھا۔ پروفیسر صاحب سے بھی ایک ایسی ہی چوک[2] ہو گئی ہے جو آئندہ نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ وزیر نامے کے مصنف[3] کا تخلص ہلال نہیں ہے اسیر ہے، وزیر نامہ کی تصنیف کے وقت (۱۲۹۳ھ) ہلال زندہ ہی کب تھے[4] مثنوی ورقا اتاج کے آخری قطعہ تاریخ میں جن امیر علی خاں ہلال کا ذکر آ گیا وہ مطبع سلطانی کے مہتمم تھے۔ میر علی اوسط رشک کے شاگرد ہلال[5] اور اسیر میں اگر کوئی بات مشترک ہے تو صرف نام کی یا واجد علی شاہ سے توسل کی، ورنہ ایک خطاب یافتہ، دوسرا "خانہ زاد" لیکن خطاب سے محروم، ایک باڑھ (بہار) کا باشندہ، دوسرا لکھنؤ کا رہنے والا۔ پروفیسر صاحب نے امیر علی خاں ہلال کے حوالے سے مثنوی عشق نامہ کے مصنف اور نام کی سند بہم پہنچائی ہے۔ قلق، اسیر اور دربار واجدی کے خطاب یافتہ سربرآوردہ حضرات کے مقابلہ میں خطاب اور مصاحبت کے لقب سے محروم ہلال بیچارے کی سند کو لوگ قبول ہی کیوں کرنے لگے لیکن ہاں اگر وہی بات وزیر السلطان نواب امیر علی خاں بہادر اسیر سے منسوب ہو تو مرحوم کے تجربہ، تدبر اور انگریزی اور واجدی دونوں دربار سے خطاب پانے اور ایک حکومت کا معتمد اور دوسرے حکمراں کا مشیر[6] ہونے کے بعد وہی بات کچھ اور ہی وزن رکھے گی اور وزیر نامے کے بیان کی یہی خوبی فیصلہ کن ہے۔ محتاط طبیعتوں کو اگر اس کے بعد بھی عشق نامہ منظوم کے نام کے بارے میں کوئی شک ہو تو خود واجد علی شاہ کے قلم سے بنی کی فہرست[7] اور مثنوی چنچل (مطبوعہ) کے اس شعر کے بعد

جو چاہے پڑھے عشق نامہ کا حال — کہ کس طرح معشوق کا ہے وصال
یہ کس طرح آئی کیا کون کام — محل کس طرح سے ہوئی نیک نام

چوں چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بنی کی فہرست میں جس عشق نامہ کا ذکر ہے[8] اس کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے فارسی نثر کی کتاب مراد ہے لیکن مندرجہ بالا شعر میں جس عشق نامہ کے لیے دعوت نظر دی گئی ہے وہ عشق نامہ منظوم ہی ہے۔ دلیل یہ کہ اسی مثنوی میں ایک دوسری تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اگر موسیقی کا پڑھے شوق جاں — تو صوت المبارک کو دیکھے جواں
اسی علم میں وہ لکھی ہے کتاب — مگر اب ہے نایاب مثل سراب
مرے عہد میں تھی وہ ہر جا عیاں — چھپی جب سے اٹھ گیا کارواں
کتب خانے میں میرے موجود ہے — وگرنہ زمانے سے مفقود ہے

عشق نامہ سے مراد اگر فارسی نثر کی کتاب ہوتی تو وہ چھپی ہی کہاں جو بلا تکلف دعوت نظر دی جاتی۔ اگر اسی مثنوی میں عشق نامہ سے مراد مخطوطہ تھا تو جب ایک مطبوعہ لیکن نایاب زمانہ کتاب کی وضاحت کر دی گئی اس ذیل میں بھی وضاحت لازم تھی۔ عشق نامہ منظوم چونکہ شائع ہو چکا تھا اور اس مثنوی کی تصنیف کے وقت (۱۲۹۵ھ) نایاب بھی نہیں تھا اس لیے کسی تشریح اور صراحت کی ضرورت نہ تھی۔ سو برس کے عرصے میں جہاں سلطان خانے اور شاہ منزل کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، ایک کتاب کی کیا حقیقت تھی؟

عشق نامہ (منظوم مطبوعہ) کی موجودہ نایابی کا سبب بھی انھیں اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ واجد علی شاہ کی صاف گوئی کے بارے میں پروفیسر صاحب نے جو کچھ کہا وہ بھی درست اور تحسین رضوی جیسے حضرات کا خیال بھی غلط نہیں۔ لیکن یہ مدح اور قدح سب واجد علی شاہ کے لیے ہے۔ عشق نامہ کا بیان اکثر بیگمات اور محلات کے لیے صرف منقصت ہی ہے۔ بیگمات کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ واجد علی شاہ کے بیباک قلم کو روک دیں لیکن یہ ممکن تھا کہ اس قلم سے جو مضر اثرات پیدا ہو سکتے ہوں ان کا انسداد کر دیا جائے۔

موجودہ زمانے میں جب کوئی کتاب ضبط ہوتی ہے تو باوجودیکہ کتاب کی اشاعت کے وقت جس کا جی چاہتا ہے خرید کر لے جاتا ہے لیکن ضبط ہونے کے بعد اگر تلاش کیجیے تو بمشکل تمام کوئی نسخہ کہیں نظر آ جائے تو آ جائے۔ مطبع سلطانی کی کتابیں تو مخصوص افراد کو تحفۃً پیش کی جاتی تھیں اور ان کی فہرست بھی رکھی جاتی ہوگی، ایسی کتابوں کو تلاش کر کے تلف کر دینا کون سا دشوار کام ہے۔ عشق نامہ کے علاوہ ہماری نظر میں اور بھی کچھ کتابیں ہیں جو اسی طرح نایاب ہیں اور ان کی نمایاں خوبی بظاہر اس کے کچھ نہیں کہ ان کے بیانات سے ممتاز افراد خاندان شاہی کے وقار کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ قلمی نسخوں کا سراغ لگانا دشوار ہے کہ کس کس نے قلمی نسخے حاصل کیے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں مطبوعہ نسخے

---

[1] تذکرۂ آب بقا ص۲

[2] لکھنؤ کے شاہی اسٹیج میں بھی ہلال ہی لکھا ہے دیکھئے مضمون ہماری زبان ۸ر جولائی ۹۵ء
سلیمان حسین صاحب نے بھی ہلال کو وزیر نامہ کا مصنف بتایا ہے۔

[3] واجد علی شاہ کی آنکھ بند ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر ہلال کی حیات یا وفات ایک اہم مسئلے میں شہادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقالے میں اس پہلو پر بھی مفصل بحث کی جائے گی۔

[4] دیکھیے نظم نامہ ورق ۲۰ اور مطبع سلطانی کی چھپی ہوئی دوسری کتابیں جن میں مرحوم کے قطعات تاریخ ہیں نیز وزیر نامہ میں ص۲۹۹ پر مقطع میں اسیر۔

[5] دیکھیے بنی قلمی ص۲۱ (۱۲۹۱ھ) اور بنی مطبوعہ ۱۲۹ھ ص۲۲-۲۳

[6] تفصیل کے لیے خود مرحوم کی کتابیں امیر نامہ اور وزیر نامہ ملاحظہ فرمائیے۔

[7] بنی قلمی ص۲۰-۲۱۹

[8] بنی مطبوعہ ص۲۳-۲۳۱

کی بعض بچی کچھی دو جلدیں دستیاب ہو ئی ہیں وہاں قلمی عشق نامے کے کئی مکمل اور قریب قریب مکمل نسخے موجود ہیں۔

واجد علی شاہ کی صاف گوئی کے بارے میں پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان پر طرفداری کا الزام وہی شخص عائد کرے گا جس نے اس دور کے سماجی حالات اور انسانی کمزوریوں کے مظاہر کا سرسری مطالعہ بھی نہ کیا ہو۔ عشق نامہ کے پڑھنے والوں میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو ایسے وسیع القلب اور صاحب نظر واقع ہوئے ہیں۔ ہماری نظر میں تو ویسے لوگ آتے ہیں جن کو یہ بھی منظور نہیں کہ اگر صاف گوئی میں واجد علی شاہ کی انفرادیت قائم ہوتی ہو اور کسی سے کچھ لے کر نہیں خود اپنی گرہ سے بہت کچھ دے کر، تو وہ اس انفرادیت کو بھی بسر و چشم قبول کر لیں۔ لالہ سری رام نے واجد علی شاہ کی اسی صاف گوئی کی تعریف میں لکھا تھا۔

"شاہ اختر ہی ایک ایسے بے دھڑک اور سچے شاعر تھے جنھوں نے اپنے تمام خفیف رازوں، دلی بھیدوں اور خانگی باتوں کو اس طرح صاف صاف الفاظ میں نہ صرف اپنی خاص مجلس اور چند محرم راز لوگوں میں بیان کیا بلکہ ان خیالات کو زیور طبع پہنا کر ملک کے سامنے بھی پیش کر دیا۔"[1]

مولوی نجم الغنی خاں نے حسب منشا اس پوری عبارت کو بعینہٖ تاریخ اودھ میں خمخانۂ جاوید کے حوالے سے نقل کیا ہے صرف ایک لفظ کی اصلاح ہے اور وہ یہ کہ لفظ "ہی" "خمخانۂ جاوید" میں ہے اور تاریخ اودھ میں نہیں ہے[2] معنویت میں اس اختلاف سے جو فرق پیدا ہوتا ہے اس پر ارباب نظر خود غور کر سکتے ہیں ہمارے بیان کی کیا حاجت! ہماری نظر میں اور ہمیں یقین ہے خود پروفیسر صاحب کی نظر میں عشق نامہ کے علاوہ وہ دوسری عبارتیں بھی ہوں گی جن کے پیش نظر لالہ سری رام کا بیان بیانِ واقعہ تصور کیا جا سکتا ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ میدانِ حشر میں بھی واجد علی شاہ کا اعمال نامہ اس سے زیادہ سیاہ نہ ہوگا جتنا کہ صفحۂ ہستی پر وہ خود اپنے قلم سے یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ اعمال نامہ کی سیاہی اور سفیدی کی فکر تو وہ لوگ کریں جن کے اعمال نامے دنیا میں نہایت مطلا اور مذہب پیش کیے جاتے ہیں اور عاقبت کی خبر خدا جانے ؎

گر نیے نہ خوری طعنہ مزن مستاں را
گر توبہ دہد توبہ کلم یزداں را
تو بدیں فخر مکن کہ من مے نخورم
صد کار کنی کہ مے غلام ست آں را

عشق نامہ اپنے اسی "اعمال نامہ" ہونے کے سبب ابتدا سے چھاپے خانے والوں اور سستی شہرت کے طلبگار رنگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہے اور اس کے انتخاب کو "خاقان سرور"[3] کے نام سے شایع کرنے والے عاصی صاحب بھی کتب فروش ہی تھے۔ پورا نسخہ نہ سہی تو انتخاب شایع کر دینا کون سا دشوار کام ہے اور اگر نام بھی نہ معلوم ہو تو ایک نام تجویز کر دینے میں اور اس نام کو موزوں ناموزوں بہر طور مثنوی میں داخل کر کے سند بہم پہنچانے میں بھی کسی غیر معمولی لیاقت کی ضرورت نہیں ہر چیز بکتی ہے بکنے والی چیز ہونا چاہیئے۔ لیکن عیب کے لیے بھی ہنر ضروری ہے اور عاصی صاحب بدقسمتی سے ایسے ہنرمند بھی نہ تھے۔ تعجب تو یہ ہے کہ امیر علی خاں ہلال کے نامی گرامی شاگرد حکیم ضامن علی جلال کا قطعۂ تاریخ بھی شامل حال ہے ؎

"وہ جو خاقان سرور اک مثنوی ہے — مصنف جس کا اختر سا سخنداں
کیا عاصی نے اس کو منتخب تا — زیادہ ہو پسند نکتہ سنجاں

جلال اس منتخب کے طبع کا سال[4]
پر تم لکھ دو سرور افزای خاقاں ۱۳۱۷ھ

آخری مصرع کی موزونیت، معنی اور اعداد کا استخراج یہ تینوں باتیں میرے فہم سے بالاتر ہیں۔ ممکن ہے "مثنوی" کی طرح یہ قطعہ بھی عاصی صاحب کا طبع زاد ہو۔ ورنہ جلال سے کیا نسبت؟

"خاقان سرور" کے علاوہ اسی مثنوی کا دوسرا نام "پریخانہ منظوم" بھی بتایا گیا ہے اور بیسویں صدی کے بیشتر لکھنے والے اس کو اسی نام سے یاد کرتے رہے ہیں لیکن اس صدی کے لکھنے والوں کی بات قابل اعتبار ہی کب ہے جبکہ ان کی تحریر سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے مکمل نسخہ دیکھا بھی ہے یا نہیں جس طرح خیالات ایک دوسرے سے مستعار لیے اسی طرح نام بھی سنی سنائی پہ لکھ دیا۔ "طلسم ہند" کے مولف منشی ہوطارام شایاں اور مولوی نجم الغنی کی تاریخ اودھ سے بے شک اس اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان دو حضرات نے مطبوعہ یا قلمی نسخۂ عشق نامہ کا دیکھا ہوگا کیونکہ ان کی کتابوں میں شروع سے آخر تک مختلف صورتیں استفادے کی نظر آتی ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف شایاں نے مکمل نسخہ دیکھا ہو! واجد علی شاہ کے ہم عصر تھے) اور نجم الغنی خاں نے کہیں شایاں کے حوالے سے اور کہیں بغیر حوالہ دیئے عبارت مع اشعار نقل کی[5] صورت خواہ کچھ ہو نتیجہ واحد ہے۔ ان حضرات نے مثنوی کا نام نہیں بتایا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں خواہ مخواہ انیسویں صدی کے واقف کار وں کی بات کا اعتبار کرنا چاہیئے کہ اس مثنوی کا نام "عشق نامہ" ہے۔

(باقی آئندہ)

[1] جلد اول ص۲۱۰

[2] جلد پنجم ص۱۱۱

[3] مثنوی خاقان سرور ص۲۲۵ و ص۲۲۶

[4] خاقان سرور ص۲۲۶

[5] دونوں کتابوں کی سرسری مطابقت پر تاریخ اودھ میں وہی شعر ملے جو طلسم ہند میں بھی ہیں۔ نئے شعر مجھے دستیاب نہیں ہوئے۔ جن حضرات کی نظر میں ان کتابوں کی اہمیت ہو وہ مطابقت کر کے اپنا اطمینان کر لیں۔ طلسم ہند کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) میں بھی ہے۔ نمبر ۹۵۳ کا ہے۔

مراسلات

اردو رسم خط میں اصلاح

"زبان و ادب کی تعلیم" پر سیمینار کے موقع پر وائس چانسلر جناب علی یاور جنگ صاحب نے اردو رسم خط میں اصلاح کا سجھاؤ دے کر بڑی اہم اور انقلابی بات کہی ہے، وہ چونکہ جنوبی ہند سے وابستہ ہیں اس لیے وہاں کے صوتی لب و لہجہ سے واقف ہیں۔ کلچرل اور قومی ایکتا کے لیے تلفظ میں مشابہت اور یکسانیت بڑی نازک بات ہے۔ مثال کے طور پر مرہٹی والے اگر کسی غیر مرہٹی والے کی زبان سے جب لفظ "مزہ" یا "آزادی" (بیار) کا تلفظ اردو کے تلفظ سے مشابہ سنیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔ لیکن اگر ہندی والوں کی طرح "مجا" یا "آجادی" جیسا تلفظ وہ سنیں گے تو انھیں کوفت ہوگی۔ اسی طرح مرہٹی میں "چ" اور "ل" کی دو الگ الگ آوازیں ہیں اور ان میں بڑا نازک فرق ہے۔ غرض ان علاقائی صوتی نزاکتوں کو سمجھنا بڑا ہی ضروری ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ سبھی علاقوں کے ماہرین لسانیات و صوتیات اور ادیبوں کی ایک کمیٹی مقرر کرے" کہ وہ اردو کے رسم خط میں اصلاحی تبدیلیوں کے سجھاؤ دے اور انجمن ان سجھاؤوں کو مستند مان کر اردو کے موجودہ حروف میں نئی نئی آوازوں کے نمائندہ نئے حروف کا اضافہ کرے یہ نئے حروف شکلوں میں موجودہ ان حروف کی شکلوں سے مشابہ ہوں جن کی آوازوں میں صوتی قربتیں ہوں۔ روسی میں "ز" کی آواز کے کئی حروف ہیں جن کی اپنی اپنی صوتی خوبیاں ہیں۔ اردو میں بھی "س" کی اور "ز" کی آوازوں کے تین اور چار الگ الگ حروف ہیں۔ ان باتوں سے کسی زبان کے دامن کی وسعت ظاہر ہوتی ہے۔

اردو کی تعلیم اور ترویج میں دوسری دقت یہ ہے کہ اس کے حروف میں مشابہ شکلوں کے گروپ تو ہیں لیکن ان کے ناموں میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ مثلاً اس گروپ "ج چ ح خ" میں سبھی کے نام اس طرح کے جے چے حے خے ہونے چاہئیں۔ اسی طرح "ب پ ت ٹ ث" کے گروپ میں ہم شکل اور ہم آواز کے نام والے "ف" کو بھی شامل کر لیا جائے اور "ی" اور "ے" کے نام "ی" [illegible] اور "یے" [illegible] رکھے جائیں۔ اس طرح کی گروپ بندی اور ترتیب سے تدریس اور تعلیم میں آسانی ہوگی۔ انھیں گروپوں میں نئی ملتی جلتی آوازوں سے حروف کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

علاقائی زبانوں کے الفاظ کے انتخاب میں وہی تلفظ اختیار کیے جائیں جو عوامی ہوں جیسے اردو نے سنسکرت کے الفاظ "अश्रु" "विद्युत" "स्वप्न" "निश्चिन्त" وغیرہ کو ان کی تلفظاً تدبھو روپ والے "آنسو" "بجلی" "سپنا" "نچنت" اختیار کیے۔ پالی بھاشا نے بھی تدبھو روپ ہی اپنائے تھے۔ اردو کے ایرانی مزاج کو بدل کر ہندی عوام کے تلفظ اور مذاق سے قریب تر کرنا ہے اور اسے صنعتی دور کی زبان بنانا ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور مختلف علاقوں میں اپنے اوزاروں اور کاموں کے سلسلے میں کون کون الفاظ کن تلفظ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ان کو اردو لغت میں جگہ دی جائے۔ انجمن کی شاخیں صنعتی مرکزوں کا وقتاً فوقتاً معائنہ اور مشاہدہ کیا کریں اور نئے الفاظ کی فہرستیں مرتب کرتے رہیں۔

امیر محمد خاں (جاسی)

تاج اللغات

ہماری زبان مورخہ ۲۲ جنوری ۹۹ء میں ایک اطلاع اس عنوان کے تحت شایع کی گئی ہے:-

"۲۵۰ سال پرانی عربی اور فارسی کی انسائیکلوپیڈیا"

یہ اطلاع اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ شایع کی جا چکی ہے۔ اطلاع دینے والے کا نام درج نہیں ہے اور اس کو ایڈیٹوریل نوٹ کے طور پر شایع کیا گیا ہے اس لیے اس کی ذمہ داری ایڈیٹر پر عاید ہوتی ہے۔ اس اطلاع میں حسب ذیل باتیں بتائی گئی ہیں:-

۱- تاج اللغات عربی اور فارسی کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔
۲- اس کی چھپائی لیتھو کی ہے۔
۳- یہ ۲۵۰ سال پرانی ہے۔
۴- اس کے ہر صفحے پر واجد علی شاہ کی مہر ثبت ہے۔
۵- یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔
۶- ہر جلد میں آٹھ سو صفحات ہیں۔

ان باتوں میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاج اللغات عربی زبان کا ایک جامع لغت ہے جس میں عربی لفظوں اور فقروں کے معانی و مطالب فارسی میں بیان کیے گئے ہیں۔ وہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد میں صفحوں کی تعداد یکساں نہیں ہے۔ کم سے کم ۱۳۰ صفحے اور زیادہ سے زیادہ ۹۳۶ صفحے ہیں۔ آٹھ سو صفحے کسی جلد میں نہیں ہیں۔ اس کے ہر صفحے کی پیشانی پر اودھ کا شاہی مارکہ چھپا ہوا ہے۔ یہ کتاب ۱۵۰ سال پرانی ہے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں شایع ہوئی جن کی تخت نشینی کو ڈیڑھ سو برس بھی نہیں ہوئے۔ اس کی چار جلدیں ٹائپ میں اور چار جلدیں لیتھو میں چھاپی گئیں۔

معلوم نہیں کہ یہ سرتاپا غلط اطلاع کس ذریعے سے حاصل ہوئی اور اس ذریعے کو اتنا قابل اعتبار کیوں سمجھا گیا کہ یہ اطلاع آنکھیں بند کر کے شایع کر دی گئی۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

---

[1] یہ خبر سیاست جدید (کانپور) کے ۸ جنوری ۹۹ء کے شمارہ میں صفحہ ۳ پر "ناظمین" کے حوالے سے شایع ہوئی تھی۔ "ہماری زبان" میں وہیں سے نقل کی گئی تھی۔ سہواً حوالہ نہ دیا جا سکا۔

ایڈیٹر "ہماری زبان"

لال بہادر شاستری جی کے انتقال پر تعزیتی جلسے

حیدرآباد کی اردو تنظیموں کا خراج عقیدت

حیدرآباد ۱۰ جنوری آندھرا پردیش کی اردو کی اہم تنظیموں، انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیات اردو اور اردو مجلس کی طرف سے مشترکہ طور پر ہونے والے ایک جلسہ میں کل یہاں مرحوم وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

جلسہ کی صدارت گجرات کے سابق گورنر مہدی نواز جنگ نے کی جلسہ نے ایک رزولیوشن منظور کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر شاستری کی وزارت عظمیٰ کے ۱۸ مہینے ہندوستان کی تاریخ میں زریں باب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

مسٹر مہدی نواز جنگ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جن دنوں وہ گجرات کے گورنر تھے اتر پردیش کے اردو بولنے والوں کے بعض مسائل کی طرف مسٹر شاستری کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ مرحوم وزیر اعظم نے فوراً جواب دیا اور یقین دلایا کہ ان مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کیا جائے گا۔

ریاستی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مسٹر حبیب الرحمٰن نے کہا کہ مسٹر شاستری کے اچانک انتقال سے ایک عظیم شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی جس نے بڑے اور نازک مسائل کو بڑے تدبر اور مہارت سے حل کیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کے صدر سید علی اکبر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وزیر اعظم کی نجی لائبریری میں متعدد اردو کتابوں کی موجودگی اردو زبان و ادب سے ان کی محبت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ وہ موقع پر اپنی تقریر میں اردو اور فارسی کے اشعار استعمال کرتے تھے اور ان کی تقریر ایسی زبان میں ہوتی تھی جسے اردو اور ہندی جاننے والے سمجھ لیتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی ہندی اس ہندی سے بالکل مختلف تھی جو آل انڈیا ریڈیو استعمال کرتا ہے۔

اردو مجلس کے صدر رائے جانکی پرشاد نے بھی اس موقع پر تقریر کی۔ بریگیڈیئر جی۔ ایم۔ سعید کی بیوی طاہرہ بانو سعید نے جو اردو کی ممتاز شاعرہ ہیں جلسے میں "شہید امن" کے عنوان سے ایک نظم سنائی۔

انجمن ترقی اردو، راجستھان

انجمن ترقی اردو راجستھان کے جملہ ارکان و معاونین و سرپرست اور سارے راجستھانی شعراء، علماء و ادباء بالخصوص حاضر الوقت اصحاب شری لال بہادر شاستری کی اچانک موت پر اپنے دلی رنج و غم اور انتہائی صدمے کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ان کی ناقابل فراموش خدمات ملک و قوم کا اعتراف کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں نیز ان کے پس ماندگان سے پوری پوری ہمدردی اور ان کے برابر کے شریک غم ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ اور یقین رکھتے ہیں کہ اس امن پسند خیر خواہ خلق کی روح کو امن سکون

اور شانتی مل چکی ہوگی اور ملتی رہے گی۔"

یہ رزولیوشن سب نے بالاتفاق دو منٹ خاموش کھڑے ہوکر منظور کیا اور قرار پایا کہ اس کی نقل اخبارات، ریڈیو اسٹیشن جے پور کو بھی بھیجی جائے اور شری شاستری کی والدہ صاحبہ اور موجودہ پرائم منسٹر صاحب حکومت ہند کو بھی نیز پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ راجستھان کو بھی بھیج دی جائے۔

اس کے بعد شعراء صاحبان نے اپنا تعزیتی کلام سنایا۔

انجمن ترقی اردو شاخ نئی دہلی

انجمن ترقی اردو شاخ نئی دہلی نے اپنے ۱۲ جنوری ۶۶ء کے اجلاس میں زیر صدارت بیگم انیس قدوائی صاحبہ ایم۔ پی۔ یہ تجویز منظور کی۔

انجمن ترقی اردو شاخ نئی دہلی کا یہ جلسہ ہندوستان کے وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری کے تاشقند میں انتقال پر اپنے گہرے دکھ اور درد و غم کا اظہار کرتا ہے کہ شاستری جی نے تاشقند معاہدہ کے ذریعہ امن اور دوستانہ تعلقات کی طرف جو قدم اٹھایا تھا اس میں روز افزوں ترقی ہوگی یہ جلسہ شری للتا شاستری اور ان کے کنبے کے دوسرے ممبروں کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

انجمن ترقی اردو شاخ نئی دہلی کا یہ جلسہ شری احمد محی الدین ڈپٹی منسٹر حکومت ہند اور منشی تلوک چند محروم کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ احمد محی الدین صاحب کی سرپرستی سالہا سال تک دلی کی انجمنوں اور خاص کر انجمن ترقی اردو کو حاصل رہی ہے۔ وہ غالب اور خسرو کے شیدائی تھے اور ان دونوں یادگاروں کے قیام میں ان کی مدد شامل حال رہی تھی۔ منشی تلوک چند محروم اردو کے عظیم شاعر اور مخلص ادیب کی حیثیت سے ۴۲ء سے برابر انجمن کی سرپرستی فرماتے رہے اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک اردو کی ترقی اور حق کے لیے کوشش کرتے رہے۔ اردو ادب ان کا انتہائی ممنون اور احسان مند ہوگا۔ یہ جلسہ بیگم محی الدین صاحب اور ان کے غم و الم میں اور محروم صاحب کی بیوی اور بیٹے جگن ناتھ آزاد کے ساتھ اس رنج و غم میں اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ یہ جلسہ پروردگار عالم سے دعا کرتا ہے کہ وہ پس ماندگان کو صبر عطا کرے اور مندرجہ بالا انہوں عظیم ہستیوں کی روح کو شانتی بخشے۔

(گلدیپ سنگھ سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ نئی دہلی)

انجمن ترقی اردو پٹیالہ

پٹیالہ ۲۰ جنوری ۶۶ء۔ انجمن ترقی اردو حسب اڈل ٹاؤن پٹیالہ کی جانب سے گذشتہ شب انجمن ہذا کے سکریٹری جناب جوہر بھارتی کی رہائش گاہ پر انجمن کے جنرل سکریٹری جناب جمیل پٹیالوی کی صدارت میں ایک ماتمی نشست ہوئی جس میں بھارت کے ہر دلعزیز وزیر اعظم فاتح جنگ شہید امن شری لال بہادر شاستری جی کی ناگہانی موت پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اس میٹنگ میں شعراء حضرات کے علاوہ شہر کی معزز ہستیوں اور ہمدرد خواہان اردو نے بھی شرکت فرمائی۔ ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں شری شاستری جی کی ملکی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں موجودہ دور کے مسلمانان قوم میں ایک عظیم رتبہ کی شخصیت قرار دیا گیا۔ (راج دیپ ارم سلطانی سکریٹری)

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تقریر

۲۸ جنوری ۶۶ء کو انجمن اردوئے معلی (شعبۂ اردو) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک جلسہ زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور شاداں لاؤنج فیکلٹی آف آرٹس میں ہوا۔ اس جلسے میں پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے "اردو کے آغاز کے مسائل" کے عنوان سے تقریر کی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ مسعود صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ لسانیاتی تحقیقات میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام "قدیم اردو" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر کے شایع کی ہے جس میں اردو کے پانچ نایاب مخطوطات کو جدید تحقیقات کی روشنی میں مختلف ماہرین کے حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شایع کیا گیا ہے۔ اور اس طرح سے "اردو زبان" کی تاریخ اور ارتقا کے شعبے میں کئی نئے پہلو سامنے آسکے ہیں۔

اردو میں لسانیات کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اس طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی جا رہی ہے۔ لسانیات کا مطالعہ صرف اردو زبان کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے بلکہ اردو ادب کے مطالعے اور تدریس کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسعود صاحب کی رہنمائی میں اردو میں لسانیات کا علم ترقی کرے گا اور ایسے ماہرین کی ایک فوج تیار ہو جائے گی جو لسانیات کی جدید تر معلومات و انکشافات سے لیس ہوں گے۔

سرور صاحب کے خیر مقدم کے بعد مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی تقریر شروع کی۔ ابتدا میں انھوں نے سرور صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں "اردو زبان و ادب کی تعلیم سے متعلق سمینار" میں بعض مصروفیات کی وجہ سے شرکت نہ کر سکا، میری یہ تقریر اسی کا کفارہ ہے۔ موضوع زیر بحث پر اظہار خیال کرتے ہوئے مسعود صاحب نے اردو زبان کے آغاز سے متعلق محمود خاں شیرانی، سید سلیمان ندوی، محمد حسین آزاد، ڈاکٹر زور، سرسید اور دوسرے ماہرین کے نظریات کا جائزہ لیا اور ان اسباب پر روشنی ڈالی جن کی وجہ سے ان حضرات نے اردو کے آغاز کے سلسلے میں مختلف نظریات پیش کیے۔ انھوں نے ان اہم مستشرقین اور ہندوستانی زبانوں کے دوسرے علما کا بھی جائزہ لیا جنھوں نے اردو، ہندی یا ہندوستانی کے آغاز اور ارتقا کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مسعود صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ پچھلے بیس سال کے مطالعے اور تحقیق سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اردو کا آغاز نواح دہلی کی بعض بولیوں خصوصاً ہریانی یا جاٹو سے ہوتا ہے۔ محمد بن تغلق نے جب دہلی سے دکن کی طرف کوچ کیا تو یہ زبان دکن گئی اور وہاں کے بعض مقامی اثرات قبول کیے لیکن دکنی اردو میں تبدیلیوں کی رفتار اتنی تیز نہیں رہی جتنی کہ شمالی ہند میں۔ اس کے بہت سے سیاسی اور سماجی اسباب ہیں۔ دکنی مخطوطات کے مطالعے سے اور شمالی ہند کی اردو کے بعض نادر نمونوں کی اشاعت سے اب اردو زبان کی تاریخ تسلسل کے ساتھ لکھی جا سکتی ہے۔

قواعد کے اعتبار سے اردو زبان میں عہد بہ عہد جو تبدیلیاں ہوئیں ان پر بھی مسعود صاحب نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔

سرور صاحب کے شکریے کے ساتھ اس جلسے کا خاتمہ ہوا۔

(نامہ نگار)

منیب الرحمن کے مجموعۂ کلام کی رسم اجرا

علی گڑھ۔ ۲۹ جنوری۔ آج شام کو خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر اور شہریار کی دعوت پر علی گڑھ کے ادیبوں اور مصنفوں کا ایک جلسہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے لاؤنج میں زیر صدارت عالی جناب محمد فضل الرحمن صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر منیب الرحمن کے مجموعۂ کلام "بازدید" کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ سب سے پہلے خلیل الرحمن اعظمی نے ایک تمہیدی تقریر کی اور اس اجتماع کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے منیب الرحمن صاحب کو ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر مبارکباد دی اور اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ منیب الرحمن ہمارے ان شاعروں میں سے ہیں جن کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں۔ گذشتہ پچیس سال سے ان کی نظمیں اردو کے بلند پایہ رسالوں میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے کلام کی مخصوص انفرادیت اور اس کے فنی حسن کا عام طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے جدید ادبی و شعری رجحانات و تحریکات کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے انھیں بخوبی علم ہے کہ منیب الرحمن کی نظمیں عام طور پر انتخابات میں جگہ پاتی رہی ہیں اور موجودہ دور کے تنقید نگاروں نے اپنے مضامین میں ان کے شعری کارناموں کا حوالہ دیا ہے۔

اعظمی صاحب نے آگے چل کر کہا کہ "منیب الرحمن اردو کے ان معدودے چند شعرا میں ہیں جنھیں صحیح معنوں میں نظم گو کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے نظم نگاری کے فنی مطالبات اور اس کے تقاضوں کو سمجھا ہے اور اس کے لیے بطور خاص ریاض کیا ہے۔ ان کی نظمیں جدید شاعری کا صالح نمونہ کہی جا سکتی ہیں اس لیے کہ ان میں وہ بے اعتدالیاں نہیں ملتیں جو عام طور پر جدید نظم سے منسوب کی جاتی ہیں۔ انھوں نے مغرب کی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس سے مثبت طور پر استفادہ کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مشرق کی تہذیبی روایات اور مشرقی مزاج کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے اس لیے منیب الرحمن صاحب کی نظموں میں فکر و فن، روایت و جدیدیت اور اجتماعیت و انفرادیت کا جو خوبصورت امتزاج ملتا ہے وہ اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ انھوں نے جنگ کی

اور صحافتی شاعری اور بے معنی جدت طرازی سے اپنا دامن بچاکر اور وقتی مقبولیت کی ترغیبات سے الگ رہ کر ایسی نظمیں لکھی ہیں جو اپنے دور کی روح کی ترجمان ہوتے ہوئے جمالیاتی قدریں رکھتی ہیں اور ان میں ابدیت کے عناصر ہیں"۔

اعظمی صاحب کی تقریر کے بعد پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جامع اور بھرپور تقریر کی۔ موصوف نے اس جلسے کے انعقاد پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس رسم کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کی تقریبات ایک طرف ہمارے ادب میں خوشگوار رجحانات کے فروغ کا موجب ہوتی ہیں دوسری طرف ہم اپنے فن کاروں کی قدر کرنا سیکھتے ہیں۔ منیب الرحمٰن کے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر ہم سب کو فخر کرنا چاہیے مجھے تو خاص طور پر اس کی اشاعت سے خوشی ہے کہ اس کو منظر عام پر لانے میں تھوڑا بہت میرا بھی حصہ ہے۔ منیب الرحمٰن صاحب میرے عزیز دوست ہیں اور میں ان کے مزاج سے واقف ہوں۔ وہ ان شاعروں میں سے ہیں جو اپنی شعری تخلیقات سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے ہمیشہ گریز کیا۔ یہ ایک لحاظ سے بڑی اچھی بات ہے کیونکہ اس طور ہر شاعر کو اپنے فن پر پیدا ریاض کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ شاعری کو ایک وقتی اور تفریحی چیز نہیں سمجھتا۔ لیکن کبھی کبھی یہ رویہ اس لیے نقصان دہ ہے کہ اس طور پر ہم ایک اچھی کتاب سے محروم رہ جاتے ہیں اور اس شاعر کے بارے میں ایک مجموعی تصور قائم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ میں نے بہت اصرار کے بعد منیب الرحمٰن صاحب کو اس مجموعے کی ترتیب و اشاعت کے لیے آمادہ کیا چنانچہ اس کی اشاعت پر مجھے وہی خوشی اور فخر ہے جو سرسید کو حالی کے مسدس کی اشاعت پر تھا۔ منیب صاحب کی کئی اور کتابوں کے مسودے ابھی تک اشاعت کے منتظر ہیں جن میں شیکسپیر کے ترجمے خاص طور پر اہم ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ چیزیں بھی جلد سے جلد شائع ہو سکیں۔

آگے چل کر سرور صاحب نے کہا کہ منیب الرحمٰن صاحب کی یہ خصوصیت مجھے بہت عزیز ہے کہ وہ شاعر محض نہیں ہیں۔ وہ سماجی کاموں میں بھی گہری دلچسپی لیتے ہیں اور زندگی سے ان کا ربط و تعلق بہت وسیع اور گہرا ہے۔ وہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جن کی شاعری انھیں دنیاوی کاموں کے قابل نہیں رہنے دیتی اور اسی بنا پر لوگوں نے یہ مفروضہ قائم کیا ہے کہ شاعر عام طور پر نکمے ہوتے ہیں۔ منیب الرحمٰن کا کلام جن لوگوں نے پڑھا ہے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ ان کی اپنی آواز اور اپنا آہنگ ہے۔ ان کی نظموں کا اسلوب اور ان کی امیجری ان کی انفرادیت اور ان کے مخصوص شعری مزاج کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے یہاں جدت بھی ہے اور جدیدیت بھی لیکن یہ جدت یا جدیدیت ان کی نظموں میں عیب بن کر سامنے نہیں آتی۔ یہ فن کار کے ہاتھ میں ہنر بن جاتی ہے۔

انھوں نے مغرب کے لالہ زاروں کی بھی سیر کی ہے لیکن ہندوستان کی دھرتی کو فراموش نہیں کیا ہے۔ میری نظر میں ان کی نظموں کی خصوصیت کو اگر ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو وہ "حسن" ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فن کا جمالیاتی پہلو ان کی نظموں میں اس طرح فطری طور پر رچ گیا ہے کہ ان کی ہر نظم خواہ وہ زندگی کے کسی موضوع سے متعلق ہو ایک حسین فن پارہ بن جاتی ہے۔ دوسری خصوصیت جسے انگریزی کے لفظ "DRAWL" سے تعبیر کر سکتے ہیں ان کی نظموں میں ایک عجیب دلکشی پیدا کرتی ہے۔ یہ بات ان کی گفتگو میں بھی ہے جو خود اپنی جگہ پر ایک دلآویز چیز ہے۔ انھوں نے الفاظ کو محض الفاظ کی حیثیت سے نہیں استعمال کیا ہے۔ اس لیے ان کی نظمیں ان کی اپنی ہیں۔ وہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو نظم لکھتے ہیں تو کبھی اقبال کا منھ چڑاتے نظر آتے ہیں تو کبھی جوش کی طرح لفظی پینترے اور بازی گری دکھا کر مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر میں سرور صاحب نے کہا کہ منیب الرحمٰن ہمارے ان جدید شاعروں میں ہیں جن پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

سرور صاحب کی تقریر کے بعد کارکنان جلسہ کی خواہش پر منیب الرحمٰن صاحب نے اپنی شاعری اور اپنے ادبی تصورات سے متعلق ایک مختصر تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آج سے چھبیس سال قبل جب شاعری شروع کی تھی اس وقت محض ایک فطری امنگ تھی اور اپنا نام چھپی ہوئی صورت میں دیکھنے کی خواہش لیکن آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہوا کہ شاعری بہت مشکل فن ہے۔ حقیقی معنوں میں جس کو شاعری کہتے ہیں اس کی معراج تو درکنار اس کے پہلے زینے تک بھی بہت کم لوگ پہنچ پاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں نے اپنی نظموں اور اپنی شعری تخلیقات سے متعلق ہمیشہ ایک بے اطمینانی محسوس کی۔ یہ سرور صاحب کی محبت ہے جس کی بنا پر میں اپنی نظموں کی اشاعت پر آمادہ ہوا۔ اگر ان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو شاید یہ کتاب کبھی منظر عام پر نہ آسکتی۔ میں اپنی شاعری کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ خلیل صاحب اور سرور صاحب نے جو کچھ میرے بارے میں کہا ہے میں

اس کے لیے مشکور ہوں۔

اپنے ادبی تصور کی وضاحت کرتے ہوئے منیب الرحمن صاحب نے کہا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دور کی SENSIBLITY کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرے۔ شاعری محض زبان و بیان یا صنائع و بدائع کا نام نہیں ہے نہ چند خیالات یا عمومی جذبات کو بیان کر دینے کو شاعری کہتے ہیں۔ شاعری ایک تخلیق ہے۔ ایک دریافت ہے۔ زندگی اور اس کے پیچ در پیچ سلسلوں کا ایک جمالیاتی اظہار ہے۔ چونکہ ہر شاعر زندگی کو اپنے طور پر ہی محسوس کرتا ہے اور اپنے تجربوں کی روشنی میں اسے دیکھتا ہے اس لیے اس کا اظہار بھی اپنا ہونا چاہیے۔ اس کے امیجز اور اس کی امیجری بھی دوسروں سے مختلف ہونی چاہیے۔ اسی وقت ہم بندھے ٹکے اور گھسے پٹے خیالات کو شعر کا جامہ پہنانے کے بجائے شاعری کے سرمائے میں ایک نئی اور تازہ تر تخلیق کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی سی کوشش یہی کی ہے کہ میں شعر کے تخلیقی عمل کے ساتھ خلوص برت سکوں۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ دوسرے ہی کر سکتے ہیں۔

اپنی تقریر کے بعد منیب الرحمن صاحب نے اپنی وہ نظمیں سنائیں جو مجموعے کی ترتیب کے بعد لکھی ہیں یا کسی وجہ سے اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ ان نظموں کے عنوانات یہ ہیں: "برفباری" "پرواز" "سنتھالی ناچ" "اگر" "پگڈنڈی" اور "برگد کا پیڑ"۔

آخر میں صدر جلسہ عالی جناب محمد فضل الرحمن صاحب نے اپنی تقریر میں کارکنان جلسہ کو اس تقریب پر مبارکباد دی اور منیب الرحمن کے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

صدر کی خواہش پر شعر و سخن کا سلسلہ اور آگے چلا جس میں پروفیسر آل احمد سرور، معین احسن جذبی، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، جاوید کمال، وارث کرمانی اور شہریار نے اپنا کلام سنایا۔

شرکائے جلسہ کو عصرانہ بھی دیا گیا۔ (نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو آندھرا کے وفد کی وزیر داخلہ و وزیر قانون سے ملاقات

حیدرآباد۔ ۲۷ جنوری مسٹر حبیب الرحمن جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو کی قیادت میں ایک وفد نے آج صبح ۱۰ بجے وزیر داخلہ کے ذریعہ وزیر داخلہ و وزیر قانون سے ملاقات کی۔ انجمن ترقی اردو کے وفد میں مسرز ہارون خاں شیروانی، مخدوم محی الدین اور راج بہادر گوڑ شامل تھے۔ وفد نے وزراء کو اردو کے موقف سے متعلق انجمن کے ادعا سے واقف کراتے ہوئے سرکاری زبان کے مسودہ قانون میں اردو زبان کے استعمال کے لیے مناسب دفعات شامل کرنے کی خواہش کی۔ جن کے تحت ایسے مخصوص علاقوں میں جہاں کی آبادی کے ۱۰ فی صدی حصہ کی مادری زبان اردو ہے سرکاری دفاتر میں اردو زبان کے استعمال کا انتظام کیا جائے۔ وفد کے اراکین نے تلگو کو سرکاری زبان قرار دینے کے اقدام کا خیر مقدم کیا۔ وفد نے بتایا کہ انجمن ترقی اردو نے اردو کو تلگو کے مساوی قانونی درجہ دینے کا مطالبہ نہیں کیا اور نہ ہی سرکاری دفاتر میں دو لسانی طریقۂ کار پر عمل کرنے اور دونوں زبانوں میں ریکارڈ رکھنے کی خواہش کی گئی ہے۔ انجمن کی جانب سے صرف یہ خواہش کی گئی ہے کہ اردو کو اس کا وہ دستوری حق دیا جائے جو دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اس زبان کو ملنا چاہیے اور مخصوص سرکاری مقاصد کے لیے اردو کے استعمال کو قانونی حیثیت دینی چاہیے۔

اردو سے متعلق تیقنات کو سرکاری زبان بل میں شامل کیا جائے

انجمن ترقی اردو کی اپیل

حیدرآباد۔ ۱۵ جنوری۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے ریاستی اسمبلی میں سرکاری زبان سے متعلق مسودہ قانون سے ایک اپیل جاری کی ہے جس میں اردو کو قانونی اور دستوری حق عطا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اپیل میں کہا گیا ہے کہ آندھرا پردیش ہندوستان کی پہلی ریاست ہے جس نے اردو کو دوسری علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور یکے بعد دیگرے ریاستی چیف منسٹروں نے خود اسمبلی میں اور اسمبلی کے باہر حکومت کی اس پالیسی کا کئی بار اعادہ کیا ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی ریاست آندھرا پردیش کی اس لسانی پالیسی کی کھلے طور پر ستائش کی تھی اور آندھرا کی اس لسانی پالیسی کو ملک کی دوسری ریاستوں کے لیے نمونہ قرار دیا تھا۔

انجمن کی اپیل میں کہا گیا ہے کہ ریاستی حکومت کا طرز عمل اردو سے ہمیشہ ہمدردانہ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی جانب سے وقتاً فوقتاً احکام جاری کیے جاتے رہے ہیں، لیکن ان احکام کی عمل آوری میں مختلف دشواریاں آج بھی درپیش ہیں۔ ان احکام کو قانونی حیثیت حاصل نہ ہونے کی وجہ متعلقہ عہدہ دار جا اردو سے متعلق حکومت کی ہدایات کو عملی جامہ پہنانے کے اقدامات نہیں کرتے جس کے باعث انھیں قانونی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔ سرکاری زبان کا بل گورنمنٹ گزٹ میں شایع ہو چکا ہے اور رائے عامہ طلب کی گئی ہے۔ انجمن نے اس بارے میں رائے بھیجتے ہوئے ایسی ترمیمیں تجویز کی ہیں جن سے اردو کے واجبی حقوق کی حفاظت ہو سکے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا۔ اور نذیر حسن پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا